بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش آغاز

• "اسلامی عسکریت" کے خاتمہ کیلئے وزیراعظم کی امریکہ سے استمداد

وزیراعظم نے اپنے مجوزہ دورۂ امریکہ پر روانگی سے قبل پاکستان میں اسلامی عسکریت کے خاتمہ کے لیے امریکہ سے خصوصی امداد طلب کرنے کی درخواست کی تھی چنانچہ ملک میں دینی مدارس کے خلاف مخصوص طریقہ اور ایک خاص حکمت عملی سے منصوبہ بندی اسی سلسلۂ مذموم کی پیش رفت ہے وزیراعظم سمیت تمام سرکاری حلقے مسلسل علماء، دینی قوتوں، دینی مدارس اور ان سے فارغ التحصیل ہونے والے فضلاء اور علماء کے خلاف برسرپیکار ہیں گویا یہ دور ایک طاقت ور جدیدیت اور علماء کے درمیان کشمکش اور آویزش کا معرکۂ آلارا دور ہے مغرب ہو یا پاکستان میں مغربی افکار کے علمبردار حکمران، مغربی میڈیا ہو یا مغرب زدہ مشرقی میڈیا ہو سب کا مشن اور ہدف ایک ہے وہ لوگوں کے اذہان میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس ملک میں فتنوں کا اگر کوئی سرچشمہ ہے تو وہ دینی عناصر، دینی جماعتیں دینی مدارس، دینی ادارے دینی حلقے اور دیندار لوگ ہیں جنہیں وزیراعظم نے "اسلامی عسکریت" سے تعبیر کیا ہے دنیا کو نہ صرف یہ کہ اس عنصر کے عزائم سے خبردار کیا جا رہا ہے بلکہ امریکہ کو اس بات کی ببانگ دہل دعوت دی گئی ہے کہ وہ ان کے قلع قمع کرنے میں بھرپور مدد کرے۔ امریکہ اپنے اس "مشیر بے نظیر" کی درخواست اور استمداد کو کس حد تک درخور اعتنا سمجھتا ہے یا اس سلسلہ میں کیا حکمت عملی اختیار کرتا ہے اس کے متعلق فی الحال تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر وزیراعظم کے اس انداز بیان اور طریق استمداد سے حکمرانوں کے دلوں کی کدورت اور دینی عناصر کے خلاف بغض و کینہ اور حسد و عداوت کی آگ اور خاص طور پر اسلامی عسکریت (دینی مدارس جس کے علمبردار ہیں اور افغانستان میں طالبان کی تحریک جس کا نقد ثمرہ ہے) کے متعلق شدید نفرت و بیزاری اور اسے نیست و نابود کر دینے کی خواہش ایک ایک لفظ سے چھلکتی ہے۔

اگر یہ محض ایک شخص کے ذاتی خیالات ہوتے تو ہم ہرگز نوٹس نہ لیتے یہ تو ایک ذمہ دار شخصیت، ایک ملک کے وزیراعظم، حکمران جماعت کے قائد کا بیان ہے جو خود کو عوامی نمائندہ کہتی ہیں انہیں اور ان کی پارٹی کے دیگر لیڈروں کو عوام کے قریب رہنے کا دعویٰ بھی ہے اور انہیں یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ "ایک عام آدمی" کے مشاہدہ و مطالعہ کا نتیجہ ہے اسلامی عسکریت کے خاتمہ کو وہ عوام کے دکھ درد، ان کی مشکلات، ان کی آرزوں اور تمناؤں کا ہدف قرار دیتے ہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہ خیالات ایک مختصر مغربی طبقے کے خیالات تو ہو سکتے ہیں یا امریکہ بہادر اور یہودیت کی دیرینہ تمناؤں کا ہدف، معلوم نہیں انہیں عوام کا دینی عناصر کے خلاف نفرت کا علم کیسے ہوا؟ ہم نے تو عوام کو جہاں بھی دیکھا انہیں مغرب زدہ طبقے اور اسلام کے اندر اس کی رخنہ اندازیوں اور اب وزیر اعظم کے امریکہ سے اسلامی عسکریت کے خاتمہ کی استمداد کے خلاف شدید غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے پایا۔

بعض لوگوں کو دینی عناصر کے بعض افراد سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر دینی رہنمائی کے لیے عوام نے اسلامی عسکریت کے علمبردار "مولوی" کو چھوڑ کر کبھی بھی "مغرب زدہ مسٹر" کی پیروی نہیں کی "مولوی" جس کو دین سے بغض و عداوت رکھنے والے طبقوں نے بالکل ایک گالی بنا کر رکھ دیا ہے آج بھی عوام کی توجہ کا مرکز ہے حال ہی میں ملی یکجہتی کونسل کے قیام اور دینی عناصر کے اتحاد نے ملک میں کسی طرح امن و سکون، نیک توقعات اور روشن مستقبل کی فضا قائم کر دی ہے عوام حلال کو حرام سے ممیز کرنے کے لیے، جائز و ناجائز کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے لیے حق اور باطل کے مابین فرق کرنے کے لیے عبادات اور معاملات میں شریعت کے احکام معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ "علماء" ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان کی بات پر اعتماد کرتے ہیں سر سید احمد خاں، سید امیر علی مولوی چراغ علی نواب محسن الملک علامہ اقبال قائد اعظم محمد علی جناح کے خدمات مسلّم، ان کا سیاسی تشخص ناقابلِ انکار، مگر عوام نے کسی ایک کو بھی مفتی تسلیم نہیں کیا عقائد اور احکام کے کسی مسئلے میں بھی ان کا فتویٰ جاری نہ ہو سکا۔

"علماء" کو ختم کرنے کے لیے حکومت کیا تدابیر اختیار کرتی ہے اور امریکہ اس کی استمداد کے جواب میں اس کے سامنے کیا لائحہ عمل رکھتا ہے ہمیں اس وقت اس سے کوئی بحث نہیں ہم دیانت داری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وزیر اعظم کے بیانات اور "علماء" کے خاتمہ کے لیے امریکہ سے استمداد، یہ درحقیقت کسی عام آدمی کے احساسات نہیں بلکہ یہ برسر اقتدار طبقے اور خود امریکہ بہادر کی خواہش ہے جو مطالبہ کی صورت میں وزیر اعظم کی زبان پر آ کر میڈیا اور قرطاس پر آ گئی ہے یہ بیان مغرب کے عزائم اور ارادوں کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے دینی مدارس کے ساتھ حکومتی رویہ اور استمداد کے الفاظ کے تیور یہ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ صرف ذاتی حد تک وزیر اعظم کا بیان نہیں ہو سکتا ان کی زبان عام ان کا اسلوب بیان اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ اس پردہ زنگاری میں کوئی خاص طاقت بیٹھی ہے۔

امریکہ سے مشاورت اور اس کی مجوزہ مدد اور دیئے گئے لائحہ عمل درآمد ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ان خطوط پر چل کر بے چارے "علماء" کو کس حیرتناک انجام تک پہنچایا جاتا ہے اس بارے میں کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ ہم تو صرف دعا کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستان سمیت تمام مسلم ممالک کے برسر اقتدار طبقوں کو سمجھ بوجھ عطا کرے اور انہیں مغرب کے تسلّط اور فریب سے بچائے البتہ مسلمانوں کے سوچنے

سمجھنے والے حلقوں کی خدمت میں ہم چند باتیں پیش کرتے ہیں تاکہ وہ ان پر غور کریں۔

پریشانی کی اصل وجہ "علماء" کا معاشرے میں غیر معمولی اثر و رسوخ ہے۔ اہل مغرب اور حکمرانوں کو یہ صدمہ لاحق ہے کہ ہمارے علماء اور ائمہ اور خطباء کا عوام سے براہ راست تعلق ہے۔ بڑے بڑے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے اور معمولی دیہات تک مساجد کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر قریہ اور بستی اور اس کا ہر محلہ اس نظام سے وابستہ ہے۔ مساجد و مدارس پر ان حضرات کا قبضہ ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازوں کے چھوٹے چھوٹے اجتماعوں سے لے کر جمعہ و عیدین کے عظیم الشان اجتماعات تک یہی حضرات عوام سے متعلق اور ان سے مخاطب رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے قائم کردہ اس "ملائی نظام" کی قوت میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے ان کے تخیل میں یہ ایک حکومت در حکومت ہے، یہ دو ہیں وہ اصل اسباب، جن کی وجہ سے دینی مدارس ان کے فارغ التحصیل ہونے والے فضلاء (اسلامی عسکریت) اور "علماء" اس مغرب زدہ اقلیت کی آنکھ میں خار بن کر کھٹک رہا ہے۔ چنانچہ پنجاب میں مساجد میں تقاریر اور اذان کے لیے لاؤڈ سپیکر پر پابندی کا آرڈر اسی درد و کرب کی کسک ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ملک کے مغرب زدہ طبقے کے نزدیک اچھائی اور برائی کا معیار یورپ اور امریکہ ہے۔ وہ زندگی کے تمام معاملات کا جائزہ مغربی اقدار حیات کے نقطہ نظر سے لیتا ہے اور پھر ان کے مطابق ہر کام کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ وہ خواہ زبان سے یہ بات نہ کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس کے نزدیک کوئی رہنما ضابطہ حیات نہیں ہے۔ یہ جس حد تک مغربی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہم رکاب ہو کر چل سکے، اس حد تک تو گوارا ہے اور جس مقام پر ان دونوں کے راستے مختلف ہوں۔ وہاں سے مغرب زدہ طبقہ اسے چھوڑ کر مغرب کی پیروی اختیار کرتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ اپنے اس طرز عمل پر وہ عوام میں ہدف ملامت نہ بنے۔ اس لئے اسلام کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی مذموم کوشش کرتا ہے اور اس کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ پھر جب دین کا علم رکھنے والے اس پر ٹوکتے ہیں اور ناقابل انکار دلائل سے ان کی من مانی تاویلات و تعبیرات کی غلطی واضح کرتے ہیں تو یہ جبر سے کام لے کر ان کو دباتا ہے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہتا ہے کہ "اسلام کی تعبیر کا حق کوئی علماء کی میراث تو نہیں ہے"

"علماء" جس وجہ سے گردن زدنی ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں ہیں اور ذہنی غلامی کا قلادہ انہوں نے اپنی گردن میں نہیں ڈالا ہے۔ وہ تنگ نظر اور متعصب نہیں ہیں کہ آپ مغرب سے واقعی کوئی مفید چیز لائیں اور وہ خواہ مخواہ اس کی مخالفت کریں۔ وہ اگر برسر اقتدار طبقے کے کسی اقدام پر ٹوکتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں اقدار کا وہ سارا نظام درہم برہم ہوتا نظر آتا ہے جس سے دین حق عبارت ہے۔ سارا فرق زاویہ

نگاہ کا ہے۔ مغرب زدہ طبقہ مادی تہذیب کے زیر اثر جن باتوں کو انتہائی ضروری سمجھتا ہے ان میں سے بہت سی باتیں "علماء" کی نظر میں غیر ضروری، اسلام سے متصادم، اور فی الحقیقت مفید ہونے کے بجائے الٹی نقصان دہ ہیں۔

"علماء" کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں مغرب کی اندھی پیروی کے بجائے اسلامی شریعت کے اصول و احکام اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہیں۔ جو امت مسلمہ کے پیش نظر ہونے چاہئیں اور حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کے درمیان اسلام نے جو رشتہ تناسب قائم کر رکھا ہے، اس میں خلل اندازی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اسلامی شریعت "اصلاح طلب" ہے اور اس کے اندر مغربی نظریات کے مطابق "اصلاح" کرنے کی ضرورت ہے۔

"عالم دین" بیچارے پر یہ الزام بھی ہے کہ اس نے ملک میں حکومت در حکومت قائم کر رکھی ہے۔ اس حکومت در حکومت کا آخر مطلب کیا ہے؟ —— جو طبقہ یہ الزام لگا رہا ہے، اقتدار کلی طور پر اس کے ہاتھ میں ہے۔ فوج پولیس ملکی نظم و نسق، سب اس کے قبضے میں ہے۔ ملک کی معاشی زندگی پر اس کا کنٹرول ہمہ گیری کے ساتھ قائم ہے۔ قانون سازی کی پوری مشینری، بلدیاتی اداروں سے لے کر اسمبلیاں اور قانون ساز اداروں (PARLIAMENT) کے علاوہ جج تک اس کی گرفت میں ہے۔ پریس اور پلیٹ فارم، دونوں کو اس نے مکمل طور پر اپنے قابو میں لے رکھا ہے۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد اب باقی کیا رہ گیا ہے، جہاں بے چارے "مولوی" نے حکومت در حکومت قائم کر رکھی ہے۔

باقی صرف یہ رہ گیا ہے کہ ابھی قوم کا ضمیر زندہ ہے، اس میں کچھ لوگ غلط کو غلط کہنے والے موجود ہیں، اور قوم اس حد تک غلام نہیں بنی ہے کہ ہر آواز جو اقتدار کے مرکز سے اٹھے اس پر بے چون و چرا آمنا و صدقنا کہہ دے۔ اس چیز کو "حکومت در حکومت" کا نام دے کر خطرے کی گھنٹیاں بجائی جا رہی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ پوری قوم کو اقتدار کے آگے سر بسجدہ ہونا چاہیئے۔ اگر ایک زبان بھی اقتدار کی کسی بات کو غلط کہنے والی اور ایک کان بھی اس کو سننے والا موجود ہے تو یہ "حکومت در حکومت" ہے جسے ختم کئے بغیر وحدہٗ لاشریک حکومت کا "لطف" حاصل نہیں ہو سکتا۔

قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے اور اسے معائب سے پاک کرنے کے لیے ہر انتہائی قدم تھا، جو اٹھایا گیا۔ اس سے ملک کے سارے اختیارات ایک ذات میں منتقل ہو گئے۔ انہیں اس بات کی پوری آزادی دی گئی کہ وہ جس طرح چاہے قوم کی بگڑی سنواریں۔ (اس تمام تر) بلا شرکت غیرے حکمرانی کرنے کے بعد اب جو نتائج سامنے آ رہے ہیں، وہ قوم کی امیدوں سے بہت کم ہیں۔ اتنے غیر معمولی ایثار کے بعد قوم بہتر ثمرات کی توقع رکھتی تھی — اس کے اندر افسردگی پیدا کر دی ہے۔

ان حالات میں انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ کامیابیوں اور ناکامیوں کا بے لاگ جائزہ لیا جاتا اور جہاں جہاں

معاملات کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں غلطی سرزد ہوتی تھی اس کا برملا اعتراف کیا جاتا اور پوری قوم کو اعتماد میں لے کر اس کے تدارک کی فکر کی جاتی۔ مگر یہاں کیا یہ جا رہا ہے کہ ناکامیوں کا سارا غصہ دینی مدارس اور اسلامی عسکریت غریب "علماء" پر نکال کر عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ سب کچھ اسی کم بخت کی مخالفت کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ راستے میں حائل نہ ہوتا تو بڑے مفید نتائج برآمد ہوتے۔

سوچنے کا یہ انداز کسی حقیقت پسند اور حق شناس انسان یا گروہ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ مثال کے طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے اس پروگرام کو ہی دیکھئے۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے اربوں روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی اور اس کا پرچار کرنے اور اس کی عملی تعلیم دینے کے لیے ڈاکٹروں، نرسوں اور دوسرے کارندوں کی ایک فوج میدان میں لا کر ڈال دی گئی اخبارات میں اس "مفید پروگرام" کے جو نتائج سامنے آئے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ یہ پروگرام شادی شدہ جوڑوں میں مقبول ہونے کے بجائے غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں میں زیادہ مقبول ہوا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ شادی شدہ افراد غیر شادی شدہ لوگوں کی بہ نسبت "مولوی" کے زیادہ زیر اثر ہیں؟ انہیں خود اپنی فلاح و بہبود کا کوئی احساس نہیں کہ ایک "مفید" چیز کو قبول نہیں کرتے؟

"علماء" کی اس وقت جو حالت ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ بے زر، بے زور اور بے یارو مددگار طبقہ حکومت کے عزائم کو ناکام بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ پروگرام "مولوی" کی مخالفت کی وجہ سے ناکام نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کی ناکامی کی بڑی وجہ قوم کے مزاج سے عدم واقفیت اور اس کے دینی احساسات سے ناآشنائی ہے۔ اور جہاں یہ کامیاب ہو رہا ہے (یعنی غیر شادی شدہ لوگ) وہاں یہ "مولوی" کی مخالفت کے باوجود خوب کامیاب ہو رہا ہے، کیونکہ اس کی پشت پر نفسیاتی اسباب کام کر رہے ہیں۔

دینی مدارس اور "مولوی" کو حکومت در حکومت کے قیام کا اس بنا پر بھی مجرم ٹھہرایا جا رہا ہے کہ اس نے اپنا ایک الگ نظام تعلیم رائج کر رکھا ہے جو اسے قوت و اقتدار بہم پہنچاتا ہے۔ اس نظام کے تحت ایک ہزار برس قبل کا مرتب کردہ "ایک دقیانوسی فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ نصاب" پڑھایا جاتا ہے جس کے تمام علوم قیاسی اور ظنی ہیں کیوں کہ اس کی بنیاد ارسطو کی منطق استخراجیہ پر رکھی گئی ہے۔ اس ضمن میں ارباب حکومت یہ سوچ رہے ہیں کہ ان سب مدارس کو ختم کر کے محکمہ اوقاف کے زیر نگرانی ایسے دارالعلوموں کا قیام عمل میں لایا جائے، جن میں عصر حاضر کے تقاضوں اور علوم سے باخبر مذہبی رہنما تیار کیے جائیں تاکہ امت مسلمہ میں "حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا درس دینے والے سیاسی طالع آزماؤں" کی تخلیق بند ہو جائے۔

حکومت کو یہ مشورہ بھی اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تعلیم و تربیت کا پورا نظام براہ راست اس کی تحویل میں چلا جائے اور کوئی آزاد تعلیمی نظام باقی نہ رہنے دیا جائے تاکہ ایک کامل ہمہ گیر ریاست (TOTALITARIAN STATE)

کے مقاصد اچھی طرح پورے ہو سکیں۔ یہ کام فکر و نظر کو جلا دینے کے لیے نہیں بلکہ افکار و جذبات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے درکار ہے۔ اس مغرب زدہ طبقے کو اپنی روشن خیالی پر بڑا فخر و ناز ہے، مگر وہ اس سادہ سی حقیقت کو بھی جاننے سے قاصر ہے کہ جو قوم اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور ان کی تخلیقی قوتوں کو ابھارنے کا داعیہ رکھتی ہو، وہ شعور و احساس کو زیادہ سے زیادہ آزاد فضا مہیا کر کے اسے پھیلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

نظام تعلیم پر حکومت کی مکمل اجارہ داری کو کبھی کسی ہوش مند قوم نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فکری اور جذباتی اعتبار سے انسانوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا جائے اور کسی وجہ سے اس مخصوص فکر اور احساس کو زوال آ جائے تو قوم کے احیاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی دانشمند قومیں اپنے ہاں ہر قسم کے نظام تعلیم کو بشرطیکہ وہ اس کے اساسی تخیل کو برباد کرنے والا نہ ہو نہ صرف برداشت کرتی ہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

انگلستان اور امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے حکومت کے اثر سے بالکل آزاد ہیں اور وہ اپنے نہج پر نوخیز نسلوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں۔ ان اداروں کی بیشتر تعداد ایسی ہے جنہیں کلیسا، معابد یا مذہبی تنظیمیں بڑی کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں۔ ان تعلیمی مراکز کو باشعور قومیں اپنے ہاں کے نخلستان سمجھتی ہیں جن میں انسان کو آزادی اور سکون کا ماحول نصیب ہوتا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے جتنی قربانی اور جرأت کا ثبوت دیا ہے، وہ کسی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔ تعلیمی جکڑ بندیاں تو دور جدید کے آمرانہ رجحانات کے شاخسانے ہیں۔

مذہبی مدارس اور دار العلوموں میں مروجہ نصاب کا ذکر مغرب زدہ طبقہ جس نفرت اور حقارت سے کرتا ہے، اس سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس طبقے کے اکثر و بیشتر افراد نے اس نصاب کو باقاعدہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ "دقیانوسی، فرسودہ اور علمی لحاظ سے افلاس زدہ" ہے۔ ہم پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس طبقہ کا یہ دعویٰ اس نصاب کے بارے میں یکسر بے خبری پر مبنی ہے۔ وہ اس نصاب کی ابجد تک بھی نہیں جانتا اور یونہی اس کے بارے میں بے سروپا باتیں کرتا رہتا ہے۔

یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ہر قدیم چیز فرسودہ اور ہر پرانا نظریہ بیکار ہے۔ حکمت اور دانائی کی بات جس طرح کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں، بالکل اسی طرح یہ کسی خاص عہد کی بھی میراث نہیں پرانے زمانے میں بھی اہل علم نے بعض ایسے افکار اور ایسی تخلیقات پیش کی ہیں۔ جو آج بھی علم و حکمت کی اساس تصور کی جاتی ہیں شیکسپیئر کے ڈرامے، چاسر، ملٹن، پوپ، اور ڈرائی ڈن کی نظمیں، آج بھی انگریزی ادب کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہیں اور

کوئی شخص ان سے کما حقہ واقفیت حاصل کئے بغیر انگریزی زبان اور ادب کی نزاکتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی طرح فلسفے اور سیاسیات میں آج بھی افلاطون اور ارسطو کے نظریات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

پورے یورپی ادب اور حکمت کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا سرچشمہ یونان کے قدیم مفکرین کے تصورات ہیں" روشن خیال یورپ" تو انہیں اپنے نصاب میں بطور بنیاد شامل کرکے نوخیز نسلوں کے دل و دماغ پر ان کے نقوش مرتسم کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے مگر ہم کسی قدیم بات کے محض اس لیے دشمن ہیں کہ اس کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس طرز فکر کا اصل محرک یہ نہیں ہے کہ ہمارے قدیم علوم فرسودہ ہیں، بلکہ اس کا اصل مقصود نوجوانوں کے ذہن میں ماضی کے خلاف نفرت پیدا کرکے اس سے ان کا فکری اور جذباتی رشتہ کاٹ دینا ہے۔

مغربی یونیورسٹیوں میں اگر شیکسپئر اور ملٹن کی کتابیں داخل نصاب ہوں اور افلاطون اور ارسطو کے خیالات سے طلبہ کو پوری طرح آشنا کرنے کا انتظام ہو تو یہ روشن خیالی اور عقل پسندی ہے، لیکن اگر عربی مدارس میں جلالین، بیضاوی صحیح بخاری صحیح مسلم ابوداؤد، نسائی، ہدایہ، دیوان حماسہ، دیوانِ متنبی اور مقاماتِ حریری پڑھانے کا انتظام ہو تو یہ سراسر "جہالت" ہے!

جو شخص تعلیمی مسائل کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہے کہ نصاب کی ترتیب میں صرف یہ چیز پیش نظر رکھی جاتی ہے کہ ایسی کتابیں درساً پڑھائی جائیں جو طلبہ کے اندر ٹھوس استعداد پیدا کرکے انہیں خود اعتمادی کے ساتھ مزید تحقیق کے لیے تیار کرسکیں جنہیں مجھے قدیم اور جدید دونوں مدارس میں تھوڑی مدت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ یہ بات بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ درس نظامی کا نصاب ٹھوس علمی قابلیت پیدا کرنے کے اعتبار سے جدید مدارس کے نصاب سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس نصاب کو اگر اچھے طریقہ سے پڑھایا جائے تو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کو سمجھنے کی راہیں آسان ہوجاتی ہیں اور وہ پھر اس طرح کی ٹھوکریں نہیں کھاتا جو آج کے متجددین بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے اور لمبی چوڑی تحقیقات کے دعوؤں کے باوجود اکثر و بیشتر کھاتے رہتے ہیں۔ جن باتوں کو یہ حضرات چند فقہی اور لغوی موشگافیاں کہتے ہیں انہی سے تو فہم دین پیدا ہوتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان حضرات نے کبھی اس نصاب کو پڑھا ہو تو انہیں یہ معلوم ہو کہ یہ باتیں کتنی ضروری ہیں۔

بہرحال دینی مدارس، اسلامی تنظیمیں، اسلامی عسکریت اور مذہبی قوتیں بلاشبہ اس وقت باہمی انتشار اور انحطاط کا شکار ہیں لیکن انہیں اتنا بھی بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ بہادر سے دست تعاون سرپرستی اور استمداد کے مطالبہ پر اس کی ظاہری شان و شوکت چمک دمک اور دہونس دھمکی سے مرعوب ہوکر دین اور دینی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ ہوجائیں گے اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں سے اپنے مٹانے کا سامان فراہم

کریں گے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اسلام پر نہایت پختہ ایمان رکھتی ہے ہاں یہ ٹھیک ہے کہ غیر ملکی اور کچھ ملکی سامراج کی جباری اور عیاری نے اور ان کے اپنے گھر کے دانا دشمنوں اور نادان دوستوں نے انہیں قوت و استحکام کے لازوال خزانوں سے محروم کر رکھا ہے جو اسلام کے ذریعہ انہیں ماضی میں حاصل ہوتے رہے لہٰذا اب وقت ہے کہ دینی قوتیں، اور اسلامی عسکریت کے علمبردار غیروں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے خدا پر اور اپنے قوت بازو پر اعتماد کریں اسلام کو مزید مضبوط پکڑیں اور زبانی اشتغال پر قناعت کرنے کے بجائے بالفعل اس سے فائدہ اٹھائیں۔

باقی رہا امریکہ، اس کا ظاہری کرّوفر، اس کے خدائی کے دعوے، نیو ورلڈ آرڈر کا پروگرام اور ہمارے حکمرانوں کی اس سے استمداد کے لیے اس کے بارگاہ میں حضوری، یہ سب عجبیات اور وقتی حالات ہیں یہ نہ تو حقانیت کی دلیل ہیں اور نہ دوام کی ضمانت ہے۔

اگر ظاہری ساز و سامان یہ دولت و حکومت تہذیب و تمدن دلیلِ حقانیت اور ثبوتِ صداقت ہوتا تو آخر بڑی بڑی پُر شوکت پُر قوت پُر ثروت نافرمان قومیں کیوں غارت ہو گئیں؛ بابل و کلدانیہ کا تمدن کیا ہو گیا؟ اہرام مصر والی عمارتیں کیوں زمین کے برابر ہو گئیں؛ شاہانِ عجم کا کروفر کیا ہوا؟ یونانیوں کا دم خم کہاں چلا گیا؟ قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کیوں تاراج ہو کر رہے؟ —— اور آج آنکھوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے زار روس کی حکومتِ قاہرہ کا تختہ کیسا الٹ کر رہا۔ قیصر ولیم اور اس کے آہنی ارادے کیوں گمنامی کی نذر ہو گئے؟ خود کو سپر پاور کہلانے والا روس کیوں تاراج ہوا؟ ہٹلر مع اپنے سارے سامانِ چنگیزی اور اتنے دم داعیہ کے کیوں فنا کے گھاٹ اتر گیا؟

امریکہ بھی اسی سلسلہ فخر و غرور کی ایک زوال پذیر حقیقت ہے اس کی بارگاہ میں حضوری اور "اسلامی عسکریت" کے خاتمہ کے لیے استمداد اسلامی تعلیمات سے استہزاء، ملک کے نظریاتی اساس سے غداری اور خداوند کریم لم یزل کی قدرت کو چیلنج اور دعوت عذاب ہے۔

عبدالقیوم حقانی